اِک وعدہ نبھانا ہے

سعد اللہ شاہ

ہم لوگ تو ہیں سیپ کے رازوں کی طرح
لب بستہ ہیں دیکھو ہمیں آنکھوں کی طرح

مجھ خستہ مکاں سے بھی نمو تیری ہے
دیوار سے نکلی ہوئی شاخوں کی طرح

بے چین سا کر دیتی ہیں یادیں تیری
سرگوشیاں کرتے ہوئے ہونٹوں کی طرح

خُوبصورت، دلکش اور
دیدہ زیب کتابوں کا
واحد مرکز

تزئین و اہتمام
عُمر دراز منتی

بار اوّل : نومبر ۱۹۹۸ء

سرورق : تنویر مُرشد

خطّاط : سلام شاد

پرنٹرز : اے۔این۔اے
پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت: ۱۲۰/- روپے

انتساب
آغا ذوالفقار خان
کے نام

کیسے سنبھال پائے گا اپنے تو ماہ و سال کو
مَیں نے اگر جھٹک دیا سر سے ترے خیال کو

سب کچھ بدل کے رکھ دیا لوگوں نے اہتمام سے
کچھ نے ترے جواب کو کچھ نے مرے سوال کو

چمکا ہے یہ زمین سے ٹوٹا ہے آسمان سے
جگنو مری مثال کو تارا تری مثال کو

نظمیں:

سعد اللہ شاہ کے شعری مجموعے

بادل چاند ہوا اور میں

بڑھا دیتی ہیں عمروں کو نہ جانے یہ کتابیں کیوں
میں چھوٹا تھا مگر سر پر کئی صدیوں کا سایا تھا

اگرچہ سعد رستے میں بڑے دلکش جزیرے تھے
مجھے ہر حال میں لیکن سمندر پار جانا تھا

سبز رُتوں کی جھلمل میں جب شاخیں پھول اُٹھاتی ہیں
بہکے بہکے سے رہتے ہیں بادل چاند ہوا اور میں

تمہی ملتے تو اچھا تھا

جہاں پھولوں کو کھلنا تھا وہیں کھلتے تو اچھا تھا
تمہی کو ہم نے چاہا تھا تمہی ملتے تو اچھا تھا

تم نے کیسا یہ رابطہ رکھا
نہ ملے ہو نہ فاصلہ رکھا

تُو نہ رسوا ہو اسلیے ہم نے
اپنی چاہت پہ دائرہ رکھا

اُداس موسم کے رتجگے

بحرِ رجز میں ہُوں نہ میں بحرِ رمل میں ہُوں
میں تو کسی کی یاد کے مشکل عمل میں ہُوں

اُس نے پوچھا جناب کیسے ہو
اِس خوشی کا حساب کیسے ہو

وقت رو کے تو میرے ہاتھوں پر
اپنے بجھتے چراغ لا رکھنا

تمہیں اقرار کرنا تھا

جو بھٹکتا ہے وہی راہ بنا جاتا ہے
ورنہ بستی میں کہاں سیدھا چلا جاتا ہے

اتنا لکھوں گا ترے بعد ترے بارے میں
آنے والوں نے تجھے پہلے ہی دیکھا ہو گا

وہ بھی بچھڑا ہُوئی رسوائی بھی
جان لیوا ہے شناسائی بھی

اک کمی سی رہ گئی

اِس میں کیا ہے کیا نہیں مجھ کو اس سے کیا غرض
وہ مجھے اچھا لگا میں نے سوچا کچھ نہیں

وہ مجھ کو چھوڑ گیا تو مجھے یقین آیا
کوئی بھی شخص ضروری نہیں کسی کے لیے

دِل بھی کیسی شے ہے دیکھو پھر خالی کا خالی
گرچہ اس میں ڈالے میں نے آنکھیں بھر بھر خواب

تشنگی باقی رہے گی

اُس کو خوشبو کی طرح ساتھ بھی رکھوں اپنے
اور پھر اُس کو زمانے سے چھپانا چاہوں

جب تلک اِک تشنگی باقی رہے گی
تیرے اندر دلکشی باقی رہے گی

مجھے کچھ اور کہنا تھا

مجھ سا کوئی جہان میں نادان بھی نہ ہو
کر کے جو عشق کہتا ہے نقصان بھی نہ ہو

لوگ فہم و آگہی میں دُور تک جاتے مگر
اے جمالِ یار تو نے راستے میں دھر لیا

محرومیوں کا اور بھی احساس یوں ہوا
چاہا تھا جو بھی تیرے سوا مجھ کو مل گیا

ادھوری رات کا غم

اپنی اپنی انا کو بھلایا جا سکتا تھا
شاید سارا شہر بچایا جا سکتا تھا

دیکھو کرشمہ سازیاں تخلیقِ شعر کی
اُترے جھیل کہیں گے کیسے کنول میں ہم

اُسے کھو کر ہم اُس کے بغیر جی لیں گے
یہ غم اگرچہ زیادہ ہے آدمی کے لیے

کچھ اپنے بارے میں

"چلو اک لفظ لکھتے ہیں" میں میری ایک موڈ کی نظمیں تھیں۔ یہ اٹھانویں کا بہار سپیل تھا۔ اِس آمد کے زیرِ اثر اتنی نظمیں ہوئیں کہ ایک علیحدہ مجموعہ بن گیا۔ گویا "نہیں کچھ بھول سکتے ہم" کے بعد کی تمام غزلیں باقی بچ گئیں تھیں۔ میرے اس شعری مجموعے "اک وعدہ نبھانا ہے" میں زیادہ غزلیں ہیں۔ غزل کہنا تو تنکا تنکا آشیانہ بنانا ہے جس سے بیرونی رابطے منقطع ہونے لگتے ہیں۔

شاعری مجھے مقناطیس کی طرح کھینچتی ہے۔ میری سوچوں میں شاعری کے ذائقے خود بخود جنم لیتے ہیں۔ خیال مہکتے ہیں۔ سچّائی اور حقیقت کا راستہ ایک بے نام دھند سے باہر آتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ہر شکست فتح کی نوید بن جاتی ہے۔ پسپائی طاقت مجتمع کرنے کی دلیل دیتی ہے۔ میرا سب سے بڑا اطمینان یہی ہے کہ میں مطمئن نہیں ہوں۔ یہاں تعبیریں

دوبارہ خواب بننے لگتی ہیں۔ اس بے چینی کی زندگی میں محبتیں داخلی اور نفرتیں خارجی عمل بن جاتی ہیں۔ یہاں سے خود پرستی کا عمل شروع ہوتا ہے جس سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو کئی بار توڑنا پڑتا ہے۔

میرے اردگرد زندگی رواں دواں ہے۔ زندگی کی اس لہر بہر سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں۔ آنکھیں زیادہ کھل جائیں تو ساری رنگین دنیا سیاہ ہو جاتی ہے۔ یہ بڑا کربناک مرحلہ ہے۔ یہ دنیا تیرہ ہونے سے پہلے ایک دفعہ بے رنگ بھی ہوتی ہے مگر اس مرحلے میں شعور زیادہ کام نہیں کرتا۔ تاہم کچھ سوچنا ہوگا۔ اپنے ہونے کا احساس دوسرے کے ہونے کا یقین دلاتا ہے۔

میرے نہ چاہنے کے باوجود بھی مجھے فنا کی طرف کھینچا جا رہا ہے۔ خود کو لافانی رکھنے کی خواہش مجھے سمندر بناتی ہے کبھی مجھے بادل اٹھاتے تھے اور اب میں بادلوں کو آنکھوں میں اٹھا لیتا ہوں۔ لیکن یہ مرحلہ بھی بے معنی ہے، معنی کہیں اور ہیں۔ اُن ساعتوں کا انتظار کرنا ہے جب پھول موسم اترتا ہے۔ آسمان پرندوں سے بھر جاتا ہے۔ خوشبو سے لدی ہوائیں روح کو چھو کر گزرتی ہیں۔ آنکھوں میں ستارے جھلملاتے ہیں اور چاند طلوع ہوتا ہے۔

یہ بات سچائی سے پُر ہے کہ انسان اپنی اصلیت کی طرف پلٹتا ہے، مگر اس میں اپنا عمل دخل بھی ضرور ہے میرا تعلق اُس گروہ سے ہے جن کے خیال

میں خدا نے انسان کو بھی ایک حد تک با اختیار بنایا ہے۔ کائنات اور انسان تخلیقی شاہکار ہیں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر دوآتشہ جمالیات کو جنم دیتے ہیں۔ جمال و جلال ایک ہی منزل کی طرف جانے والے دو راستے ہیں۔ اگر مقصد نکل جائے تو پھر دونوں بھٹکا دیتے ہیں۔

زندگی قہقہہ نہیں مسکراہٹ ہے موت اس کے برعکس روّیہ رکھتی ہے سنجیدگی میں ظاہر چھپ جاتا ہے اور باطن ظہور کرتا ہے۔ آنکھ سوتی ہے دل جاگتا ہے۔ جو کچھ وارد ہوتا ہے محسوس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اپنی کشش سے لوگوں کو بچانا اور ان کے اثر سے دور رہنا دونوں کٹھن کام ہیں کسی حرفِ معتبر کے حوالے سے میں اس حصار سے نکلنا چاہتا ہوں۔ خواہش بڑی ہو تو اُس کا اجر ضرور ہے۔

مَیں کچھ نہیں ہوں اور مجھے دعویٰ بھی کوئی نہیں۔ وقت کے بہاؤ میں بہتا ہوا ایک لمحہ میرا استعارا ہے۔ یہ ذرہ کسی نسبت سے چمکتا ضرور ہے۔ بہت مشہور ہونے والا شخص خود سے اتنا ہی زیادہ ناواقف رہتا ہے۔ یہ المیہ اُس کی سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ اپنی پہچان کروانے کے لیے انسان کتنے رنگ بدلتا ہے۔ یہ کتنی معصومیت کی بات ہے۔

دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اتنا کٹ کر رہنا ٹھیک نہیں۔ اُنہیں کیا پتہ کہ رابطے کاٹنے سے کون سا رشتہ اُستوار ہوتا ہے۔ مَیں روابط کے خلاف نہیں ہوں نہ ہی میڈیا کی افادیت سے انکار کر سکتا ہوں۔ بس مزاج کی بات

ہے۔ ایک زمانے میں ٹی۔ ہاؤس جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ ریڈیو اور ٹی۔وی کا بھی ایک دور ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ بعض شاعر اور ادیب ہمیشہ ان کی سطح پر رہ کر نہیں لکھ سکتے۔ خیر یہ باتیں ضمناً آگئیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان جب اپنی تلاش میں نکل پڑے تو گم ہو جاتا ہے۔ اور۔ میں بھی ایک گمشدہ شخص ہوں۔

دوستوں کی خواہش ہے کہ میں اپنا مختصر تعارف لکھ دوں تاکہ قارئین کی خواہش پوری ہو سکے۔ اگرچہ میں اس کو ضروری نہیں سمجھتا تاہم احتراماً عرض ہے کہ میں چشتیاں تحصیل میں پیدا ہوا میرے والد حسن نصر اللہ شاہ ہیں اور دادا حبیب تلونڈی تھے جو کہ ایک مشہور شاعر تھے۔ میں نے کہیں لکھا تھا کہ میں اپنے والد اور دادا کے ساتھ مشاعرے پڑھنے بھی جاتا رہا ہوں۔ میں کوئی اچھا طالب علم نہیں تھا۔ گھر والے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ میٹرک میں میری میتھ میں کمپارٹ آئی اور حساب کتاب میں میری قابلیت اب تک وہی ہے۔ میں نے بی۔ اے گورنمنٹ ڈگری کالج چشتیاں سے کیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں مجھے یونیورسٹی آف دی پنجاب کے شعبہ انگریزی میں داخلہ ملا۔ یہ دور وہ ہے جب میں مکمل طور پر شاعری میں محو ہو گیا۔ ان دنوں میں نے زیادہ تر انگریزی نظمیں لکھیں جو کہ مختلف انگریزی اخبارات میں چھپتی رہیں اور بعد میں ان نظموں کو BLINKING STARE کتاب کی صورت یکجا کر دیا گیا۔

۱۹۸۵ء میں میری تقرری گورنمنٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں ہوئی۔ دو سال کی مدت گزارنے کے بعد مجھے لاہور گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ تاحال میں یہیں اپنی ذمہ داریاں نبھا رہا ہوں۔ باقی ادبی تعارف تو آپ کے سامنے ہے آصف شفیع نے مکمل کتاب لکھ ڈالی ہے جس کا نام "سعد اللہ شاہ فکر و فن کے آئینے میں" ہے۔ میرے دو بیٹے عمیر اور زبیر ہیں اور دو بیٹیاں صبیحہ اور خدیجہ ہیں۔ اپنا سٹار مجھے معلوم نہیں کیونکہ میں ان چیزوں پر بالکل بھی یقین نہیں کرتا۔ یہ فارغ اور نکمّے لوگوں کا مشغلہ ہے۔

جس کام کے لیے مجھے وقت نہیں مل رہا وہ ناول ہے۔ مکمل پلاٹ بنا ہوا ہے۔ گزشتہ چھ سات سال سے مسلسل بیٹھک کے انتظار میں ہوں۔ میری شدید خواہش ہے کہ اس پراجیکٹ کو مکمل کروں انشاء اللہ اب کچھ لکھ دوں گا۔

میرے شعری مجموعے عمر دراز مفتی شائع کر رہا ہے۔ اُس نے ادارے کا نام بھی میرے نام پر رکھا ہے یعنی "سعد پبلی کیشنز" اس سے پیشتر پولیمر، ماورا، اورینٹ، الحمد اور عمیر پبلشرز نے میرے شعری مجموعے شائع کیے تھے۔ اب نئے ایڈیشن اور

نیا شعری مجموعہ اسی نام کے ساتھ آئے گا۔ سعد اللہ شاہ

ستلج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

غزلیں

○

تُو ہے ہر اک خیال سے آگے
تجھ کو یہ ذہن کس طرح سوچے

اے خُدا سر جھکا دیا مَیں نے
اب یہ تجھ پر کہ تُو قبول کرے

اے خدا اپنا خوف دے مجھ کو
آنکھ تیری ہی یاد میں بھیگے

جی میں آتا ہے جب بھی پیار ترا
چاہتا ہوں کہ اب نہ سانس آئے

اے خدا کر تُو درگزر ہم سے
ورنہ کون ان کا جو جیے نہ مرے

یہ جہاں بھی کہاں سماتا تھا
وہم دل میں جگہ بناتا تھا

اے محمدؐ ترے طفیل ملا
وہ خدا جو سمجھ نہ آتا تھا

تجھ کو رحمت بنا کے بھیجا گیا
غمِ انساں تجھے رُلاتا تھا

تُو تو معراج تھا اس انساں کی
جس کو جینا تلک نہ آتا تھا

ہاتھ اٹھاتا تھا تُو دعا کے لیے
جب زمانہ تجھے ستاتا تھا

○

جو ہُوا کربلا میں ہونا تھا
کچھ بھی ممکن نہیں تھا اس کے سوا

کیسے جھکتا عدو کے آگے وہ
وہ جو کٹ کے بھی سربلند رہا

دُنیا جس کو حسینؓ کہتی ہے
وہ نواسہ مرے رسولؐ کا تھا

وہ کسی اور ہی جہان میں تھا
جس نے گھر بار تک لُٹا ڈالا

کیا خبر کیا تھا حوصلہ اُس کا
ننّھے اصغر کو جس نے بوسہ دیا

اِک کرب ہے آنکھوں میں اک درد ہے سینے میں
کیا رمز ہے مرنے میں کیا راز ہے جینے میں

اک جذبۂ مستانہ ، اک جرأتِ رندانہ
اِس عشق و محبّت میں اس زہر کے پینے میں

طوفان ہے جذبوں کا سیلاب ہے اشکوں کا
اک درد عجب سا ہے ساون کے مہینے میں

کچھ ٹوٹے ہوئے سپنے کچھ روٹھے ہوئے اپنے
بس اس کے سوا کیا ہے یادوں کے دفینے میں

خاموش بھی رہنا ہے دُکھ درد بھی سہنا ہے
آداب ہیں سب شامل اُلفت کے قرینے ہیں

کیا لیں گے تمہیں پا کر ساحل کی طرف جا کر
طوفان اٹھایا ہے ہم نے تو سفینے ہیں

اے سعدؔ اٹھا اس کو پھرے سے تخیّل کے
اک سانپ ہے لفظوں کا معنی کے خزینے ہیں

ہم لوگ تو ہیں سیپ کے رازوں کی طرح
لب بستہ ہیں دیکھو ہمیں آنکھوں کی طرح

مجھ خستہ مکاں سے بھی نمو تیری ہے
دیوار سے نکلی ہوئی شاخوں کی طرح

تُو آج بھی رستے میں پڑا ہے میرے
پیروں سے اُلجھتے ہوئے سایوں کی طرح

بے چین سا کر دیتی ہیں یادیں تیری
سرگوشیاں کرتے ہُوئے ہونٹوں کی طرح

تُو نے کبھی دیکھا نہیں دیوانوں کو
ویرانے بھی کِھل اٹھتے ہیں باغوں کی طرح

کُھلتی ہی نہیں یار حقیقت تیری
اس تن سے لپٹتے ہوئے خوابوں کی طرح

صورت گری کی دل نے مرے شعروں کی
جڑتے ہیں یہ ٹوٹے ہوئے رشتوں کی طرح

مَیں زمیں ہوں جو تیری تو سر پہ مرے آسماں کھول دے
آ کہ ہم بھی ہواؤں سے باتیں کریں بادباں کھول دے

اپنی سوچوں کے صحرا میں جلتا ہوں مَیں اے ہوائے شمال
تُو اٹھا کہ کوئی ابر سر پر مرے سائباں کھول دے

یُوں تو کہنے کو مَیں نے نہیں کچھ کہا پھر بھی مشکل ہوا
بات چُھوٹے اگر ذکر تیرا تو پھر داستاں کھول دے

راز کی کچھ حقیقت نہیں ہے فقط اک تمنّا کہ اب
وہ جو خود ہم بتانا نہیں چاہتے راز داں کھول دے

اے خدا تجھ کو تصویر کیسے کرے یہ تخیّل مرا
جس بھی صورت کو دیکھوں وہ مجھ پر نیا اک جہاں کھول دے

کیسے سنبھال پائے گا اپنے تو ماہ و سال کو
مَیں نے اگر جھٹک دیا سر سے ترے خیال کو

سب کچھ بدل کے رکھ دیا لوگوں نے اہتمام سے
کچھ نے ترے جواب کو کچھ نے مرے سوال کو

کیسے دل و دماغ نے تجھ کو قبول کر لیا
اک نے ترے جمال کو اک نے ترے جلال کو

چمکا ہے یہ زمین سے ٹوٹا ہے آسمان سے
جگنو مری مثال کو تارا تری مثال کو

تُو نے بھی مجھ کو پا لیا مَیں نے بھی تجھ کو پا لیا
تُو نے مرے زوال کو مَیں نے ترے کمال کو

کس نے کہا تھا چھوڑ دیں لوگوں سے میل جول بھی
شکوہ کسی سے کیا کریں پہنچے ہیں اپنے حال کو

ہونا تھا جو بھی ہو گیا کھونا تھا جو بھی کھو گیا
خود ہی بتا کہ کیا کروں اب میں ترے ملال کو

اُس کو بھی بچانا ہے خود کو بھی بچانا ہے
اک سمت ہے ذات اپنی اک سمت زمانہ ہے

ہم سے نہ کوئی اُلجھے ہم لوگ ہیں دیوانے
آندھی سے ہمیں ضد ہے اک دیپ جلانا ہے

ہم دونوں کو بانٹا ہے دریا کے کناروں نے
اِس سمت بھی رہنا ہے اُس سمت بھی جانا ہے

یہ عشق تو فطرت ہے کیسے ہو جدا مجھ سے
یہ روگ ہے مٹی کا اور صدیوں پرانا ہے

بستی ہی چھپا لی پھر اس شخص نے ہاتھوں میں
اتنا جو کہا میں نے اک شہر بسانا ہے

اک آنکھ ہے صحرا تو اک آنکھ سمندر ہے
کیا جانیے اس دل میں کس کس کو سمانا ہے

کہنے کو بہت کچھ ہے اے سعدؔ مگر ہم نے
اک وعدہ نبھانا ہے اک درد چھپانا ہے

○

اب اندھیروں میں کرے آ کے اُجالا کوئی
ایک حسرت ہے کہ ہو چاہنے والا کوئی

اے مرے دوست مجھے پیار کے لہجے میں بُلا
ورنہ پھر کر نہ سکے گا تو ازالہ کوئی

اک پہاڑی کا تصوّر کہ ہو جو آگ ہی آگ
اور اک پل میں لگے، برف کا گالا کوئی

پیار اتنا بھی تو اچھا نہیں اس مٹّی سے
تجھ کو دے دے گا یونہی دیس نکالا کوئی

اس زباں کو بھی کوئی پاسِ زباں ہے شاید
جس زباں پر کہ پڑا رہتا ہے تالا کوئی

اپنے ہی خیر خواہ نے برباد کر دیا
یعنی کہ دل کی چاہ نے برباد کر دیا

ہم کو تو اپنے ساتھ بھی ملنے نہیں دیا
دنیا کی رسم وراہ نے برباد کر دیا

ٹکرا گئے تھے اس سے ہم اسکی بساط پر
ہم کو بس ایک شاہ نے برباد کر دیا

آنکھیں جھپکتے رہ گئے اس روشنی میں لوگ
ہم کو تو مہر و ماہ نے برباد کر دیا

اے سعد اُن سے پوچھیے کس حال میں ہیں وہ
جن کو دلِ تباہ نے برباد کر دیا

آؤ اشکوں کو اب شمار کرو
آؤ دیکھو اُتر کے دریا میں

اُف جھپکنا تمہاری آنکھوں کا
زخم کیسے کوئی گنے میرے

ہر شخص یہی تو کہہ رہا ہے
یاں کون کسی کا آشنا ہے

جب تک مرا دل ہے ساتھ میرے
ہر سمت ہی ایک راستہ ہے

کچھ لوگ بتا رہے ہیں مجھ کو
وہ مجھ سے بچھڑ نہیں سکا ہے

پھر کون یہ ساتھ چل رہا ہے
گر چاند اُسی جگہ کھڑا ہے

معلوم نہیں ہوا کو شاید
یہ ابر اُسے خود ہی مانگتا ہے

غم سے اشکوں کو بھی تلخواب بنا لیتا ہوں
مَیں کہ رُسوائی کے اسباب بنا لیتا ہوں

ہر کسی شے میں مجھے حسن نظر آتا ہے
ہر حقیقت کو مَیں اک خواب بنا لیتا ہوں

اک سمندر ہے مری آنکھ میں دل تک گھرا
اپنے سینے پہ میں گرداب بنا لیتا ہوں

اشک چبھتے ہیں جو کانٹوں کی طرح آنکھوں میں
دل خرابے کو میں شاداب بنا لیتا ہوں

سعدؔ یہ میرا تخیّل ہے لہو سے پیدا
میں تو ہر خواب کو سُرخاب بنا لیتا ہوں

---

(۷)

اک خوف سا رہتا ہے ہر وقت خیالوں میں
تاریکیاں شب کی ہیں دن بھر کے اجالوں میں

ہر بات پہ اپنی وہ خاموش سا رہتا ہے
جیسے کہ جواب اپنے پنہاں ہیں سوالوں میں

دیکھا ہے تمہیں ہم نے اپنے ہی حوالے سے
کچھ رنگ اضافی ہیں ان دیکھنے والوں میں

وہ ٹھیک ہی کہتا ہے اوقات ہے کیا میری
میں ڈھونڈتا ہوں خود کو لفظوں کے حوالوں میں

رسوائی مقدر ہے، لیکن کوئی حد اس کی
یہ عشق تو لے آیا ہم کو بھی رسالوں میں

جیسے بھی ہیں جو بھی ہیں بالکل ہیں جدا سب سے
بن ڈھونڈے ملیں گے ہم اے سعد مثالوں میں

اے سعد اسی سے ہے روشن یہ جہاں سارا
اک جذبہ جو پنہاں ہے ان چاند کے ہالوں میں

○

نارسائے آب کچھ تو سیکھ لے
عشق کے آداب کچھ تو سیکھ لے

کچھ نہ کچھ تو ہے تری تعبیر بھی
اے کہ محوِ خواب کچھ تو سیکھ لے

اس کتابِ زندگی میں تُو بھی ہے
تُو برائے باب کچھ تو سیکھ لے

تیری عزّت بھی تو میرے دم سے ہے
واقفِ اسباب کچھ تو سیکھ لے

سعد اتنی بے رُخی ہے کس لیے
دشمنِ احباب کچھ تو سیکھ لے

○

ہم کہ پیروں پہ سنبھل کیوں نہیں جاتے
اپنے حالات بدل کیوں نہیں جاتے

مصلحت کوشی سے بہتر ہے مرے دوست
ہم لڑائی سے نکل کیوں نہیں جاتے

آگ اب راکھ ہوئی جاتی ہے اے دل
ہیں جو جذبے تو مچل کیوں نہیں جاتے

آج حیران ہے پھر راہنما بھی
لوگ لفظوں سے بہل کیوں نہیں جاتے

لوگ سڑکوں پہ کھڑے سوچتے ہیں کچھ
اب وہ شہروں کو نگل کیوں نہیں جاتے

ہم کسی طور بدل کیوں نہیں جاتے
اپنے ہی سانچے میں ڈھل کیوں نہیں جاتے

آگ جذبوں کی کہاں بجھتی ہے رو کر
اب ہم اس عشق میں جل کیوں نہیں جاتے

کس لیے گھومتے رہتے ہیں ستارے
اے خدا سر سے یہ ٹل کیوں نہیں جاتے

ایک مدّت سے خزانے ہیں پڑے ہیں
ہیں کھرے سکّے تو چل کیوں نہیں جاتے

سعدؔ کچھ سوچنا ہوگا ہمیں آخر
سوچ کی رسّی کے بل کیوں نہیں جاتے

جان سے جان جدا ہو تو سہی
اپنی پہچان جدا ہو تو سہی

کس کو آرام بُرا لگتا ہے
درد سے دھیان جدا ہو تو سہی

خود میں آجائیں گے واپس ہم بھی
پہلے مہمان جدا ہو تو سہی

جی میں آتا ہے کہ کیا بات کریں
کوئی ارمان جدا ہو تو سہی

سعدؔ ہم ایک قدم بڑھ کر ہیں
ہم سے شیطان جدا ہو تو سہی

اپنا اپنا درد اٹھائے پھرتے ہیں
جو خواہش کو شعر بنائے پھرتے ہیں

کون کہے گا دل میں ہے اک ویرانہ
ہم آنکھوں میں باغ سجائے پھرتے ہیں

من رستوں میں سوچیں پھرتی رہتی ہیں
جیسے جوگی دیس پرائے پھرتے ہیں

اک دوجے کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں بادل
جیسے کوئی بات چھپائے پھرتے ہیں

اک بارش سی ہوتی رہتی ہے دل میں
جس میں کچھ ارمان نہائے پھرتے ہیں

سعدؔ سنبھل کر پیر اٹھانا ہے ان کو
ہم پانی پر نقش بنائے پھرتے ہیں

جس طرف بھی دیکھیے اک خلا ہے سامنے
آنکھ جب تک دیکھتی ہے یہ بلا ہے سامنے

اک اذیّت ہی تو ہے جان جانا یہ کہ اب
کیا بُرا ہے سامنے کیا بھلا ہے سامنے

بند کر لوں آنکھ کو کس طرح میں دیکھ کر
رات گزری سامنے دن ڈھلا ہے سامنے

○

آنکھ میں اک سانحہ رکھّا گیا
دل سے اس کا رابطہ رکھّا گیا

یہ چکور اور چاند کا ہے مسئلہ
درمیاں کیوں فاصلہ رکھّا گیا

دیکھتا پھر کس کو وہ اپنے سوا
سامنے جب آئنہ رکھّا گیا

سونے والوں کا بھی مجھ پر بوجھ ہے
کیوں مجھے یوں جاگتا رکھّا گیا

(ب)

کھُل کے رویا کرو گے راتوں کو
خوب بھیگا کرو گے راتوں کو

اپنی چاہت کو خواب بننے دو
ورنہ جاگا کرو گے راتوں کو

دن گزارا ہے کن خیالوں میں
تم بھی سوچا کرو گے راتوں کو

خوف اترتا ہے تیرگی ہی میں
خود سے لپٹا کرو گے راتوں کو

کیا ہوئے خواب جو تمہارے تھے
بیٹھے پوچھا کرو گے راتوں کو

○

کس سے شکوہ کرو گے راتوں کو
تنہا بیٹھا کرو گے راتوں کو

چاند بھی تو سراب جیسا ہے
کس کا پیچھا کرو گے راتوں کو

تم بھی اُٹھو گے بادلوں کی طرح
اور برسا کرو گے راتوں کو

تیرگی بھی پناہیں ڈھونڈے گی
تم جو نکلا کرو گے راتوں کو

تم کو جگنو اداس کر دیں گے
اشک بویا کرو گے راتوں کو

ایسے لگتا ہے کچھ بھی بس میں نہیں
ورنہ ایسے میں پھوٹ کر روتا

چارہ گر سے نہیں ہے کچھ مطلب
زخم اپنا ہے درد اپنا ہے

○

اُس نے کیسی مری وکالت کی
کیا ضرورت تھی ہر وضاحت کی

کیوں اذیت میں خود کو ڈال لیا
مَیں نے خود ہی سے کیوں بغاوت کی

راج کرتا رہا ہے مجھ پہ کوئی
مَیں کہ جاگیر تھا محبّت کی

کوئی دشمن نہ کوئی دوست رہا
زندگی خوب ہے شرافت کی

تیرے لہجے میں آئی کیوں تلخی
تُو نے کس شخص سے رفاقت کی

خواب، خواہش، امید اور چاہت
ہم نے کس کس کی ہے کفالت کی

سعدؔ آنکھوں میں اشک آئے ہیں
یہ نشانی سی ہے ندامت میں

اپنے ہاتھوں پہ ہم نے بیعت کی
داد ہم کو ملے شجاعت کی

ہم کہ رُسوا کبھی نہ ہوتے یوں
مگر آنکھیں نہیں ہیں چاہت کی

کچھ تو ہم کو خلوص نے مارا
اور کچھ آپ نے سیاست کی

سعدؔ باتوں پہ اپنی دھیان تو دے
بازگشت ان میں ہے جہالت کی

سعدؔ آساں نہیں ہے پسپائی
بات اس میں ہے ساری طاقت کی

خود سے نکلو تو کوئی بات بھی ہے
اک رکاوٹ تمہاری ذات بھی ہے

مَیں کہاں تک سمیٹ لوں تجھ کو
سامنے پوری کائنات بھی ہے

اُن کو حق ہے کہ دن گزاریں وہ
دھیان میں جن کے اپنی رات بھی ہے

جشن کیسے منائیں جیت کا ہم
اس میں شامل تمہاری مات بھی ہے

وہ یونہی کیسے آگیا دل میں
سعد اس میں تمہارا ہات بھی ہے

پیار دل سے کبھی نکلتا نہیں
یہ سمندر یونہی اُچھلتا نہیں

ہے تمازت عجب محبّت میں
یہ وہ سورج ہے جو کہ ڈھلتا نہیں

کوئی روشن ہے میرے اشکوں میں
ہر دیا پانیوں میں جلتا نہیں

مَیں کہ بپھرا ہُوا سمندر ہوں
میرے ساحل پہ کوئی چلتا نہیں

دائرہ کھینچ کر بھی دیکھا ہے
عشق کا بھوت سر سے ٹلتا نہیں

یہ تو رہتا ہے کام پر اپنے
دل بدلنے سے بھی دل بدلتا نہیں

بات دل کی وہ کیوں اُگلتا نہیں
ہے جو جذبہ تو کیوں مچلتا نہیں

سر اُٹھاتا ہے ناگ خواہش کا
مَیں کہ دل کو یونہی مسلتا نہیں

اک امر بیل ہے تری ہر یاد
پیڑ اُمیدوں کا کوئی پھلتا نہیں

ایک دلدل ہے سعدؔ یہ دُنیا
جو پھسلتا ہے وہ سنبھلتا نہیں

سچ کا پودا بھی پانی مانگتا ہے
یہ بھی آسانیوں سے پلتا نہیں

نقش بادل نے پھر ابھارا کوئی
یاد آنے لگا دوبارہ کوئی

راکھ اُڑاؤ نہ اس طرح دیکھو
پھر نکل آئے گا شرارہ کوئی

کب سے بیٹھا ہوں کھول کر کھڑکی
مجھ پہ کھُلتا نہیں نظارہ کوئی

وہ جو طوفاں اٹھائے پھرتے ہیں
پاس اُن کے نہیں کنارہ کوئی

چھوٹ جائے نہ ہاتھ سے میرے
سعد شہرت بھی ہے غبارہ کوئی

چھوڑ دو سعد مان کرنا بھی
اُس پہ اپنا نہیں اجارہ کوئی

ایک جگنو نہ اک ستارا کوئی
کاش آئے نظر ہمارا کوئی

اپنے قدموں پہ چل رہے ہیں ہم
اس سے بڑھ کر نہیں سہارا کوئی

ہم سمجھتے تھے ہم سے ہے محفل
'کون ہو تم' وہیں پکارا کوئی

سب مری دشمنی میں بیٹھے ہیں
ورنہ ان میں نہیں تمہارا کوئی

سعدؔ باہر نہیں ہے اب کچھ بھی
کاش اندر ہی سے اشارہ کوئی

پھول جب بھی حساب دیتے ہیں
بن کے کانٹے جواب دیتے ہیں

وقت رُکتا نہیں کسی لمحے
لمحے کیا کیا عذاب دیتے ہیں

اُس کی تعبیر دیکھنے کے لیے
ہم بھی آنکھوں کو خواب دیتے ہیں

زندگی تُو ذرا ٹھہر تو سہی
ہم تمہیں اک نصاب دیتے ہیں

عشق کرنا تو پھر یہ ڈرنا کیوں
لوگ تو پھر خطاب دیتے ہیں

جمع کرتے ہیں سال بھر خود کو
اور نئی اک کتاب دیتے ہیں

○

اُس کا اس دل پہ اثر لگتا ہے
بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے

ایک دنیا ہے مرے ساتھ یہاں
کتنا تنہا مرا گھر لگتا ہے

پھر ہے طوفان کوئی اس دل میں
اے مرے دیدۂ تر لگتا ہے

ایک در اُس میں بھی کُھل جاتا ہے
جب بھی دیوار سے سر لگتا ہے

کون اڑاتا ہے یہاں بے پر کی
بات ہوتی ہے تو پَر لگتا ہے

○

واہموں سے ذہن میرا بھر گیا
پیشتر ہی موت سے دل مر گیا

مَیں بچاتا ہی رہا دستار کو
دیکھتے ہی دیکھتے یہ سر گیا

اک خلش سی دے گیا ہے وہ مجھے
کام اپنا وہ یہاں بھی کر گیا

وہ ڈراتا تھا مجھے ہر بات سے
اس طرح سے میرا سارا ڈر گیا

میرے ہاتھوں پہ ہوئیں نہریں رواں
وہ ہتھیلی پہ جو آنکھیں دھر گیا

فکر ہے ہم کو نئے اک زخم کی
وہ سمجھتے ہیں کہ پہلا بھر گیا

میری دستار میں ہے اس کا سر
اور یہ بوجھ بھی نہیں اس کو

مجھ کو بے وزن کر دیا جائے
یا پھر اس کو کشش نہ اتنی ملے

ہر کام بگڑتا ہے ہم جیسوں کا ہو ہو کے
اُن کو بھی کوئی پوچھے بیٹھے ہیں جو رو رو کے

ہم جاگنے والوں کو زندوں میں سمجھتے ہیں
مر جاتے ہیں کتنے ہی میری طرح سو سو کے

دامن تو ہے دامن پھر پھیلانا ہی پڑتا ہے
یہ صاف نہیں رہتا دیکھا اسے دھو دھو کے

جس چیز سے قربت ہو آجاتی ہے دوری بھی
اک شخص کو پایا ہے اک شخص نے کھو کھو کے

اے سعدؔ چلو چھوڑو کچھ دیر کو سستا لو
یہ بوجھ ہے سوچوں کا مر جاؤ گے ڈھو ڈھو کے

درد لمحے کا فسوں جاگا ہے
عقل کی ضد پہ جنوں جاگا ہے

اور کچھ بھی تو نہیں ہے شاید
یہ مرا جذبِ دروں جاگا ہے

ذہن سوتا تھا مرے جسم کے ساتھ
رُوح جاگی ہے تو خوں جاگا ہے

وہ پریشان ہے شاید اُس پر
اب مرا حالِ زبوں جاگا ہے

مجھ کو سونے ہی نہیں دیتا سعد
دل جو جاگا ہے تو یوں جاگا ہے

اس بات کو چھوڑو کہ بُرا ہوں کہ بھلائیں
جب آگ لگی تم کو تو اُس میں بھی جلائیں

اپنی ہی خرابی کے سبب آئی رُکاوٹ!
جس سمت کہا دل نے اسی سمت چلائیں

پانی نے اُٹھایا کبھی مٹی نے اُڑایا
اے صورتِ تقدیر ترے سنگ ڈھلائیں

دیکھو تو ملے مجھ کو مری ٹھوس حقیقت
ورنہ تری آنکھوں میں ہوں خوابیدہ خلا میں

آنسو تھا کسی آنکھ میں یا ایک گہر تھا
آغوش میں اک سیپ کی اے سعد پلا میں

ہر جبر سے لڑتا ہی تو آیا ہوں سدا میں
تم پاؤں اٹھاؤ کہ نہیں ڈرنے لگا میں

کیا شامِ الم ہے کہ ستارے بھی ہوئے گُم
کیا کم ہے کہ موجود ہوں جگنو کی طرح میں

میری تو وراثت بھی ہے اس خون سے پیدا
ہے اس میں بقا میری کہ ہو جاؤں فنا میں

دیکھو تو ملے مجھ کو مری ٹھوس حقیقت
ورنہ تری آنکھوں میں ہوں خوابیدہ خلا میں

آنسو تھا کسی آنکھ میں یا ایک گہر تھا
آغوش میں اک سیپ کی اے سعد پلا میں

ہر جبر سے لڑتا ہی تو آیا ہوں سدا میں
تم پاؤں اٹھاؤ کہ نہیں ڈرنے لگا میں

کیا شامِ الم ہے کہ ستارے بھی ہوئے گم
کیا کم ہے کہ موجود ہوں جگنو کی طرح میں

میری تو وراثت بھی ہے اس خون سے پیدا
ہے اس میں بقا میری کہ ہو جاؤں فنا میں

کیا ظلم کہ انعام ہوں مَیں اپنی زمیں کا
بخشش ہے کہ ہوں اپنے لیے آپ سزائیں

کچھ بات تو مجھ میں بھی ہے جو سب سے الگ ھے
ممکن ہے کہ ہو جاؤں کبھی خود سے جُدا مَیں

○

اُس کی یاد بُھلانے میں اب کچھ تو وقت لگے گا
خود تک واپس آنے میں اب کچھ تو وقت لگے گا

پتّھر سے ٹکرا کر شیشہ بکھرا کرچی کرچی
اس کا بھید بتانے میں اب کچھ تو وقت لگے گا

دُھندلا دُھندلا نقش ہے اُس کا اور میں اپنے نشے میں
سارے رنگ اٹھانے میں اب کچھ تو وقت لگے گا

جی بھر آیا ذکر سے اس کے جانے کیوں محفل میں
اپنے اشک چھپانے میں اب کچھ تو وقت لگے گا

اتنی جلدی کیا ہے تم کو آؤ پاس تو بیٹھو
درد کہانی سنانے میں اب کچھ تو وقت لگے گا

مَیں فرہاد ہوں وہ ہے شیریں اور یہ کوہِ گراں ہے
دودھ کی نہر بہانے میں اب کچھ تو وقت لگے گا

ہر ایک بات پہ ہنسنا بھی اور ہنسانا بھی
تمہارے پاس ہے رونا بھی اور رُلانا بھی

جو تم نہیں ہو تو بے رنگ ہیں تضاد سبھی
تمہارے ساتھ حقیقت بھی ہے فسانہ بھی

عجیب قصّۂ غم ہے کہ جو سُنے وہ ہنسے
کہ جو سُنانا ہے ہم کو وہی چھپانا بھی

اب اس مقام پہ بیٹھے ہیں اس کی محفل میں
اسے بٹھانا بھی لازم ہے اور اُٹھانا بھی

یہ پیار بھی تو مری جاں چراغ ہے گویا
ہوا نے جس کو جلانا بھی ہے بجھانا بھی

بھڑک رہا ہے جو شعلہ تو احتیاط بھی ہے
کہ اس کی لَو کو گھٹانا بھی ہے بڑھانا بھی

وہ لمحہ بھی بھاری تھا، یہ لمحہ بھی بھاری ہے
اس عشق میں خواری تھی، اس عشق میں خواری ہے

اُس نے تو بھلایا تھا، ہم نے بھی بھُلا ڈالا
وہ زخم بھی کاری تھا، یہ زخم بھی کاری ہے

تب عشق میں روتے تھے اب عشق پہ ہنستے ہیں
کیا کارگزاری تھی، کیا کارگزاری ہے

اک رقص میں تھی دُنیا اک رقص میں ہے دُنیا
پیسہ ہی مداری تھا، پیسہ ہی مداری ہے

کیسا یہ تغیّر ہے کچھ فرق نہیں جس میں
اک شخص کی باری تھی، اک شخص کی باری ہے

اے سعد غزل کہنا اک کرب میں ہے رہنا
اک زُلف سنواری تھی، اک زُلف سنواری ہے

○

غصّہ ہو کہ نفرت ہو وہ شکل ہی پیاری ہے
جو بات بھی ہے اس کی وہ بات ہماری ہے

اک غم مجھے اس کا تھا، اک غم مجھے اپنا تھا
دو لخت ہوا ہوں تو یہ رات گزاری ہے

یہ جان تمہاری ہے تم مانگ کے دیکھو تو
ہم نقد تمہیں دیں گے جو چیز اُدھاری ہے

یہ دل ابھی خالی ہے اس دل میں نہیں کوئی
جو چیز تمہاری تھی وہ چیز تمہاری ہے

اے سعد کوئی ہم سا ضدی بھی نہیں ہوگا
جو شخص کہ دشمن ہے اس شخص سے یاری ہے

جب بھی آنکھیں بھر آتی ہیں
دل کو خالی کر جاتی ہیں

دل جلتا ہے دھڑکن دھڑکن
لیکن آنکھیں "ٹھر" جاتی ہیں

جسم کو زندہ رکھنے والو
اس میں روحیں مَر جاتی ہیں

ڈرتا ہوں کہ بلائیں ساری
واپس اپنے گھر جاتی ہیں

کیوں دہلیز پہ جاتے جاتے
یادیں آنکھیں دھر جاتی ہیں

○

لگتا ہے دل میں اپنے کوئی چور بھی نہیں
اب تو وہ پہلے جیسا یہاں شور بھی نہیں

یہ پیار بھی تو درد ہے اٹھتا ہے بار بار
اس پر ستم کہ اس پہ کوئی زور بھی نہیں

کھنچتا ہے دل پتنگ کے مانند اس کے ساتھ
اور دیکھیے تو بیچ کوئی ڈور بھی نہیں

بچپن میں ناچتا تھا جو جنگل میں آنکھ کی
اب تو ہماری یاد میں وہ مور بھی نہیں

باتیں بہت میں کرتا ہوں لیکن ہوں جاناں
تیرے لیے تو بات مری بور بھی نہیں

اے سعد جس کو مان لیں بہتر کسی طرح
ڈھونڈا اُسے مگر وہ کسی اور بھی نہیں

○

درد کی لذّت سے کوئی آشنا ملتا نہیں
اُس نے بھی تو یہ کہا تھا آپ سا ملتا نہیں

سوچتے ہیں کونسے رستے پہ رکھیں اب قدم
پہلے لگتا تھا کہ ہم کو راستہ ملتا نہیں

رُک تو جائیں ہم بھی لیکن ہے کشش میں دہر کی
جس جگہ ہو فیصلہ، وہ فاصلہ ملتا نہیں

ہم مزاجاً مختلف تھے اس لیے تنہا رہے
لوگ سمجھے ہیں کہ ہم کو قافلہ ملتا نہیں

عارضی سا اک تعلّق اُس نے رکھّا ہے فقط
بے وفا کو ہم سا کوئی با وفا ملتا نہیں

اس زمیں کو چاند تاروں سے سنوارا آسمانوں نے
اور اسے پھر تیرگی سے بھی گزارا آسمانوں نے

اب کے برفانی ہوا نے مار ہی ڈالا تھا جیتے جی
دے دیا پھر دھوپ کا مجھ کو سہارا آسمانوں نے

مجھ کو اپنے چاند کے ہالے میں ہی رکھّا گیا کیسے
کہکشانوں میں رکیا ہے اک اشارہ آسمانوں نے

چاند تارے سب کے سب جاسوس لگتے ہیں ذرا دیکھو
کھول رکھّا ہے کوئی خفیہ ادارہ آسمانوں نے

آنکھ والے اُڑ رہے ہیں اس زمیں کے اردگرد اب تک
ماورا رکھا ہے اپنا ہر کنارہ آسمانوں نے

زندگی کا کرب کیسا ہے کہ جس کے ختم کرنے کو
موت جیسی ایک آفت کو اُتارا آسمانوں نے

مجھ کو دیکھو کہ کسقدر خوش ہوں
کون کہتا ہے غمزدہ ہوں میں

ایک حد ہے اُڑان کی آخر
مجھ کو میرے ہنر نے مار دیا

○

نئے تم ہو نئے ہم ہیں
نئی رُت ہے نئے غم ہیں

ستاروں کو نہ دیکھو تم
جھکی مژگاں پہ کیا کم ہیں

اٹھا لو اپنے ہاتھوں کو
تمہارے ہاتھ بھی نم ہیں

ہماری کیا بساط آخر
غنیمت ہے جو دو دم ہیں

ہمیں کیا ہم تو سیدھے ہیں
تمہاری زُلف میں خم ہیں

یہی تو مسئلہ ہے سعد
اُدھر تم ہو اِدھر ہم ہیں

ہوا ہے جو بھی چھوڑو اب ضرورت کیا بتانے کی
کہانی گر نہیں بنتی تو کیوں کوشش بنانے کی

بکھر جائے سیاہی تو ستارے جھلملاتے ہیں
یہی صورت تو ہے چندا کو واپس ڈھونڈ لانے کی

مری جاں ہاں یہ ہوتا ہے کہ صدیاں بیت جاتی ہیں
کہ صورت تک نہیں بنتی ہے پھر ہنسنے ہنسانے کی

کفِ افسوس مَلنے سے اگرچہ فرق پڑتا ہے
مگر تم کو ضرورت کیا نئی زحمت اٹھانے کی

برابر تک رہے ہو تم ذرا سی دیر تو ٹھہرو
زمانے سے بھی کچھ سیکھو ذرا سن لو زمانے کی

○

ہمارے ساتھ بھی دیکھو عجب تماشہ ہے
وہ اپنے ساتھ ہے اور کس قدر زیادہ ہے

یہ کس طرح کی ہے تنہائی ہم نہیں سمجھے
ہمارے ساتھ یہ کیا ہے جو بے تحاشہ ہے

یہیں نہ چھوڑ دیں سب کچھ کہ یہ ہمارا نہیں
کہ اس سے آگے کہیں فقر کا اثاثہ ہے

یہی کمال ہے اس کا کہ ریت پر ہے رواں
سمجھ سکو تو سمندر بھی ہم سا پیاسا ہے

بہت ہی پھیلتی جاتی ہے داستاں اپنی
سمیٹتے ہی بنے گی، یہی خلاصہ ہے

ہماری آنکھ تو صدیوں سے بادشاہ پہ ہے
اگرچہ ہاتھ میں اپنے فقط پیادہ ہے

○

یہ خوش گمانیاں ہیں کہ ہیں بدگمانیاں
جن کے سبب سے بنتی ہیں اکثر کہانیاں

اس داستاں کے بیچ بھی اجڑا ہے ایک شہر
آباد ہو رہی ہیں اُسی کی نشانیاں

کہنے کو ہم نے کہہ دیا لو بھول بھی گئے
اپنی جگہ ہیں تازہ وہ باتیں پرانیاں

کیسی عجیب بات ہے جذبہ وہیں رہا
گو آئے داستاں میں نئے راجے رانیاں

تلخی چھپی ہوئی تھی مرے انگ انگ میں
کم کر رہی ہیں جس کو مری خوش بیانیاں

کہنی تھی بات اور تو کہہ دی ہے اور کچھ
اے سعدؔ دیکھ اپنی یہ دامن بچانیاں

کیا کہا تھا میری بابت کچھ تو بتاؤ آگے
مت گھبراؤ سُنتا ہوں میں اور سناؤ آگے

آپس کی ان باتوں میں یہ شور شرابا کیسا
جو کہنا ہے خاموشی سے کہتے آؤ گے

اب تک تیری کہانی میں کوئی بچھڑا بھی تو نہیں ہے
اس سے آگے کیا بنتی ہے اور بتاؤ آگے

اُتنا واپس آنے میں اب کچھ تو دیر لگے گی
کس نے کہا تھا عشق میں اُس کے اتنا جاؤ آگے

ایک جگہ پر ٹھہرے گی تو پھر بھی ڈوبے گی یہ
کاغذ کی اس کشتی کو اب اور بہاؤ آگے

مایوسی تو ظلم ہے خود پر مت گھبراؤ ایسے
اُجڑی بستی کو اب چھوڑو شہر بساؤ آگے

○

اِک دل بنا رہا ہوں میں دل کے مکین میں
مشکل سے بات بنتی ہے مشکل زمین میں

انسان اپنے آپ کو پہچانتا نہیں
اک سانپ بولتا ہے سپیرے کی بین میں

فرصت ہمیں ملی تو کبھی لیں گے سر سے کام
اک در بنانا چاہیے دیوارِ چین میں

پستی میں اور بلندی میں اک ربط بھی تو ہے
آئے گا اک جھکاؤ بھی اس شہ نشین میں

اے دوست میرے سر میں سمایا ہوا ہے وہم
خنجر چھپا ہوا ہے کسی آستین میں

اے سعدؔ اس کو دیکھو نہ اتنے قریب سے
بدصورتی بھی ہوتی ہے ہر اک حسین میں

احساسِ رایگانیٔ فکرِ سخن بھی ہے
لیکن فصیلِ روح سے باہر بدن بھی ہے

اے رات تیرے ساتھ میں جاگوں تو کس طرح
لپٹی مرے وجود سے دن کی تھکن بھی ہے

لگتا ہے لاشعور میں بیٹھا ہے وہ کہیں
کہتے ہیں لوگ بات میں اپنے چُبھن بھی ہے

تشریح کیا کریں گے محبّت کی دنیادار
اک سمت سے یہ باغ ہے اک سمت بن بھی ہے

اس عاشقی میں خوار ہیں سب میرؔ ہوں کہ سعدؔ
لیکن اسی کے ساتھ ہی اک بانکپن بھی ہے

یہ جو تھوڑی سی دنیاداری ہے
دل اسے بھی خراب کر دے گا

اے طبیبو مرا علاج کرو
کیوں محبّت نہیں ہے خود سے مجھے

مَیں بھی کرتا کئی گِلے شکوے
پر اجازت نہ دی طبیعت نے

مَیں محبّت کو زندگی سمجھا
اس محبّت نے مار ڈالا مجھے

نام لکھّا ہی تھا ابھی اس کا
اپنے اشکوں سے حرف مٹنے لگے

مَیں کہ آگے کی سمت چلتا ہوں
اور پیچھے کو جاتے ہیں رستے

سعدؔ بیٹھا ہوں دیکھتا اُن کو
چھوڑتے جاتے ہیں شجر پتّے

○

کیسے بدلے ہوئے ہیں سب چہرے
تُو گزر جا یہاں سے بِن دیکھے

ٹوٹتے جا رہے ہیں اندر سے
خود کو باہر سے کوئی کیا جوڑے

اپنے احساس کو ہُوا ہے کیا
کیسے ہم اس کے ساتھ چلتے رہے

تُو نہیں جانتا ہے خواہش کو
آسماں سے ستارے بھی ٹوٹے

سعدؔ آزاد کر ہی دو ہم کو
ہم اسیری میں بھی اگر ہیں بُرے

دل گرفتہ اُٹھیں ہیں محفل سے
کیا کریں آدمی مزاجوں کے

مجھ پہ طاری ہے کیفیت اس کی
کس قدر قیمتی ہیں یہ لمحے

شمع کیسے بُجھے گی تا بہ سحر
اب تو جلنے لگے ہیں پروانے

اک امربیل تھی محبّت بھی
کاٹنے پڑ گئے ہمیں ٹھنے

سعدؔ پتھر بنا لیا خود کو
آئنے سے نہ کوئی ٹکرائے

○

سعدؔ جی بھر کے تم ہنسو اب کے
آج بن کر عدو کھُلے اپنے

مَیں سکوں کی تلاش میں نکلا
میرے آتے ہی گونجے ویرانے

مَیں نہ کہتا تھا ہے شناسائی
دیکھ لے کیسے رابطے ٹوٹے

ہم نے سوچا تھا غم علیحدہ ہیں
ساتھ اپنے مگر پھلے پھولے

سعدؔ جدوجہد سے ہاتھ نہ کھینچ
کیوں سنانے لگا ہے تو دُکھڑے

جذبے پانی بن جاتے ہیں

مجھ کو چھوڑ کے جانے والے
گھنے درختوں کے سائے میں رہنے والے
وقت گزرنے پر یہ باہم پیار کے رشتے
ایک کہانی بن جاتے ہیں
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو
سُوکھے پیڑ بھی ایک نشانی بن جاتے ہیں
وہ رستے جو ہم سے چُھٹ جاتے ہیں برسوں پہلے

رفتہ رفتہ اک حیرانی بن جاتے ہیں
اور پھر اُن سے اس دل تک کے سارے علاقے
کُوکتی، چلّاتی ویرانی بن جاتے ہیں
تم کیا جانو آنکھیں کیسے صحرا بنتی ہیں
اور جذبے کیسے پانی بن جاتے ہیں

آخری شکست

اشک تھمتے نہیں مَیں نے اُس نے کہا
وہ کہ سُنتے ہی یہ بات ہنسنے لگا
اور خاموش میں اُس کو تکتا رہا
ایسے دیکھا تو وہ مجھ سے گویا ہوا
"تُو تو ایسے ہی اے سعد گھبرا گیا
جو بھی آنسو گرا سمجھو موتی بنا"

آج تک میں پڑا ہوں یہی سوچتا
وہ جو دیکھا تھا میں نے کوئی خواب تھا
استعاروں پہ کیوں میں نے سب کو لیا
اشک تھا وہ مرا یا کہ تھا سانحہ
ایک جگنو اُڑا ایک تارا گرا
وہ کہیں چل دیا میں کہیں چل دیا
اُس کا رستہ جدا میرا رستہ جدا
ایسے ہی میں نے اِس دل کو سمجھا لیا

مجھ کو اس پر بھی کیا چین آتا بھلا
اشک تھمتے نہیں میں نے دل سے کہا
دل کے ردِّ عمل نے بھی حیراں کیا
وہ توقع کے برعکس ہنسنے لگا
میں نے گھٹنوں پہ چپکے سے سر رکھ لیا

اِک آرزو

چاہے مرا زخم بھرنے نہ دو
لیکن مجھے تم بکھرنے نہ دو

دیکھو ہواؤں میں کیا زور ہے
ان میں بلاؤں کا بھی شور ہے
مجھ پر خزاں کو اترنے نہ دو
دیکھو مجھے تم بکھرنے نہ دو

گلشن کی رونق یہی پھول ہے
ورنہ تو پھر دھول ہی دھول ہے
روکو ہوا کو گزرنے نہ دو
دیکھو مجھے تم بکھرنے نہ دو

لیکن تمہارے بھی بس میں کہاں
قسمت کسی دسترس میں کہاں
جو بھی ہو تم مجھے ایسے مرنے نہ دو
دیکھو مجھے تم بکھرنے نہ دو

آئینۂ خیال

آئینے کی پشت پر رکھا ہوا ہے اک خیال
جس نے یکجا کر دیا ہے
اک سوال اور اک جواب
یہ سوال اک عشق کا ہے
حسن ہے جس پر وبال
ایک لذت سی ہے اس میں

اور اک اَن دیکھا ملال
ایک ہی رنگت میں آیا
کتنے رنگوں کا کمال

منہ زور بارش کے سامنے

چھتوں پر لوگ حیراں ہیں
زمیں پر آسمانوں سے سمندر اک مسلط ہے
کسے طاقت کہ روکے
فیلِ ابرِ باد و باراں کو
ہوائیں دم بخود پیڑوں پہ جیسے
نوحہ خوانی کے لیے اتری ہوئی ہیں۔اور

پرندے بھی پڑے ہیں پر سمیٹے۔ کیا کہے کوئی
اذانوں پر اذانیں دے رہے ہیں لوگ بھی لیکن
مگر یہ قہر ہے شاید
اسے معصوم بچّوں کی دُعائیں ٹال سکتی ہیں

وہ چاہے تو

وہ چاہے تو ملا دے آسمانوں سے زمینوں کو
وہ چاہے تو ہوائیں لاد لائیں بحرِ طوفاں کو
وہ چاہے تو مٹا ڈالے مکانوں کو مکینوں کو
مگر کچھ پیشتر اس سے جھکا دو تم جبینوں کو

ہم خرافات کا شکار ہوئے
مسجد اپنی امام اپنا ہے

دیکھا ہوا منظر

کالے بادل زلفوں کے
چاند سے گورے مکھڑے پر
تیز ہوا میں سانسوں کی
اُڑتے دیکھ رہا ہوں میں

دو نئے قصّے

آئینے میں
خود ہی اس نے ڈال رکھی ہے لکیر
اب گلہ کیسا
کہ وہ تقسیم دو حصّوں میں ہے
کس طرح مربوط اپنی اس کہانی کو کریں
جس کا اک اک باب اب کے دو نئے قصّوں میں ہے

آئنے کو دیکھنا ہے غور سے

آئینے میں صرف چہرہ ہی نہیں ہے
میری پوری ذات ہے
میرے چہرے پر
نری یہ مسکراہٹ ہی نہیں ہے
اس کے پیچھے
میرے دل کی بات ہے
مختصر سے ایک دن پر
کس لیے حیراں ہوں میں
پیش منظر میں جو اس کے

ایک لمبی رات ہے
آئینے کو دیکھنا ہے غور سے
آر پار اس میں ہماری مات ہے

شاید یہ بھی نظم نہیں ہے

لاکھ کہو تم نظم نہیں یہ
لیکن مجھ کو اچھّا لگا ہے
مَیں نے بلّی پر لکھا ہے
کتنی اچھی لگتی تھی وہ
دودھ پلاتی تھی بچوں کو
لیکن یہ تو نظم نہیں ہے
شاید ٹھیک ہی کہتے ہو تم
کیسا پیارا منظر تھا وہ

آنکھیں بند کیے جب ڈیزی
اپنا جسم حوالے کر کے
اپنے ننھے سے بچّوں کے
ایک سکون میں لیٹی ہوئی تھی
ایسے لگتا تھا تب مجھ کو
جیسے میرے چاروں جانب
سچی خوشیاں ناچ رہی تھیں
شاید یہ بھی نظم نہیں ہے
ایسے نظم کہاں بنتی ہے
مجھ کو اس بلّی کے بچّے
کچھ کچھ ایسے لگے جیسے وہ
سبز رُتوں میں اک پودے پر
تازہ تازہ پھول کھلے ہوں
پھر اک اور خیال بھی آیا
جیسے باغ کا مالی کوئی

اپنے پودوں اور بوٹوں کو
اپنے لہو سے سینچ رہا ہو
یا پھر کوئی پھلوں کا پودا
اپنا سب کچھ ثمر کو دے دے
لیکن یہ بھی نظم نہیں ہے
ایسی سوچ میں نظم کہاں ہو
اپنی دھوپ میں جلتے رہنا
اور سائے میں ڈھلتے رہنا
جن راہوں پر قربانی ہو
اُن راہوں پر چلتے رہنا
مَیں نے بلّی سے سیکھا ہے
لیکن یہ بھی نظم نہیں ہے

مَیں کہاں وادیوں میں گھوما ہوں
یہ ہیں پیدا مرے تخیّل سے

کوئی جادو ہے یا اک نظر ہے

ذہن کو منجمد کر دیا ہے کسی نے
میری سوچیں کہ جیسی سُتی رسیاں ہیں
کوئی گرہوں پہ گرہیں لگاتا چلا جا رہا ہے
مَیں کہ مصروف ہوں کام میں
اور اذیّت بھی جھیلے چلا جا رہا ہوں

وہم کیسا ہے جس نے مجھے آن گھیرا ہے ایسے
حرفِ ابجد سے نکلے کوئی معجزہ ہی

پھول جھول جاتا ہے

بیٹھتی ہیں پھول پر
جب کبھی یہ تتلیاں
پھول جھول آتا ہے
رنج بھول جاتا ہے
جب کبھی صبا اسے
چومتی ہے پیار سے
تتلیوں کے ساتھ یہ
جھوم جھوم جاتا ہے

کیا خوشی مناتا ہے
پھول کی یہ زندگی
کس قدر ہے پُر اثر
سوچتا ہوں میں مگر
کیوں نہیں ملی اُسے
اس سے آگے کی خبر

شاعری

شاعری تو شاعری ہے چائے کا اک کپ نہیں
اس کو ڈھونڈو تو کہیں
قولِ فیصل ہے کہ اس میں پیچ سی پیدا ہوئی
ایک فقرے میں چھپی ہے اک اذیّت عصر کی
کیا لکھیں اور کیا کہیں
بول دیں یا چپ رہیں
وہ جو اک اظہار ہوتا تھا کہیں
دل میں اک احساس ہوتا تھا کہیں

زندگی سے پُرھتی جب یہ سانس بھی

کیوں نظر آتی نہیں ہے ابکے صورت آپ سی

استعارے اور تشبیہیں سبھی مردہ ہوئے

معنی اُن میں چھپ گئے ہیں دیکھ کر دُنیا نئی

کیوں برابر لگ رہی ہے سب کہی اور اَن کہی

چائے کا اک کپ نہیں ہے شاعری

اپنا سراغ

آ جا مِل کر بیٹھیں

اک دوجے کو ڈھونڈیں

مَیں چُھپتا ہوں تجھ میں

آ تو چُھپ جا مجھ میں

میری باتوں پر تُو

ایسے پریشاں کیوں ہے

اور یوں حیراں کیوں ہے

کیا تو جھٹلا دے گا

اپنے دل کی چاہت
کیا تو گُم نہیں رہتا
کیا مَیں غم نہیں سہتا
کیا یہ سارا زمانہ
تجھ سے کچھ نہیں کہتا
آ جا خود سے نکلیں
اک دوجے کو ڈھونڈیں

کشش سے باہر کشش

ایک سیّارا ہوں مَیں اور
گھومتا پھرتا ہوں بس
ایک چکّر میں کسی نے ڈال رکھّا ہے مجھے
اک کشش ہے جس کے تابع ہے یہ ساری کائنات
اپنے بارے میں مَیں سوچوں گا کبھی
کون لیکن مجھ کو سکھلائے گا حرفوں کا ہنر
کون بتلائے گا اب
کس طرح آزاد ہونا ہے مجھے

کوئی جادو ہے یا اک نظر ہے

اک تغیر ہے کوئی

کوئی بھی نام دے دو اسے تم مگر — ہاں

یہ بھی میرے لیے اک خوشی ہے

ذات نے میری مصروف رکھا ہوا ہے کسی کو

دیکھنا خود کو ذرا تم دیکھنا

کون اُمّیدوں پہ تیری پورا اترے گا کبھی

اُس کے اپنے بس میں بھی تو کچھ نہیں

اور اُس کی دسترس سے ماورا ہیں فیصلے

سب ضرورت کے لیے ہیں۔ رابطے اور ضابطے

چپ رہو اور خوش رہو

ورنہ جلنے سے نہیں ہے فائدہ

قسمتوں کے پھیر کو سمجھے گا کون

لیکن اس کے ساتھ ساتھ

یہ تماشہ ہو رہا ہے ذہن میں

میں اگر اب بھی نہ سنبھلا تو کہاں جاؤں گا میں

اک کشش جو میرے اندر آ چکی ہے

وہ بھی تو پھر گُل کھلائے گی کہیں

مجسّم یقیں

سوچتا ہوں یہ سفر باہر کا اک جیسا نہیں

دیکھتا ہوں یہ مکاں

اور اس میں چلتے یہ مکیں

سب کی آنکھیں ایک جیسی

اور اک جیسی ہے پیروں کے تلے اُن کی زمیں

اپنے اندر کے سفر سے کس طرح لوٹے ہیں وہ

مَیں تو اب تک سوچتا ہوں بیٹھ کر

اپنے دل سے کیسے نکلے گا کبھی
اک مجسّم سا یقیں
پوری دُنیا میں تو کیا
اُس کے جیسا دوسرا ممکن نہیں

اپنے ہمزاد کی آواز

سعد ! تو قلب و نظر میں
آسماں سی ایک وسعت کو اُتار
یہ تری محرومیاں اپنی جگہ ہیں
اور ان کو اپنے اوپر جھیلنے کا حوصلہ اپنی جگہ
اپنے اندر جھانک کر بھی دیکھ لے

ہر علاقہ نیل گوں ہے
اپنی وسعت اور گہرائی کے ساتھ
خوف کیسا آؤ ڈھونڈیں مہر و مہ کو
اور بھر لیں روشنی سی آنکھ میں